فکر و نظر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پارلیمنٹ اور تعبیرِ شریعت

ملوکیت سے بیزاری —— مگر —— آمریت سے استواری

تقلید کی جکڑ بندیوں نے جہاں اسلامی فکر و نظر کی قوتوں کو گھائل کیا اور ذہنی غلامی کو پروان چڑھایا ہے، وہاں اس سے بغاوت کرنے والوں نے اجتہاد کے نام پر دین میں تحریف و تبدیل کے ذریعہ ایک دوسری انتہاء کو جنم دیا ہے —— لیکن کیا یہ بات انتہائی عجیب نہیں کہ تقلید کے چنگل سے آزادی حاصل کرنے کی کوششوں میں ان متجددین نے بھی اپنے مزعومہ "مجتہدین" (حکومت و پارلیمنٹ) کو اپنا مقتداء و پیشوا بنا کر ان کے افکار و نظریات کی پرستش شروع کر دی ہے، اور جس کے نتیجہ میں وہ اسی تقلید اور شخصیت پرستی کے پھیر سے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں، جس سے انہوں نے بغاوت کی ٹھان لی تھی؟ —— گویا ان کی نظروں میں ائمہ سلف کی تقلید تو مذموم ٹھہری، لیکن "فقیہانِ" دورِ حاضر، کہ جنہیں ائمۂ سلف سے کوئی نسبت ہی نہیں، کی تقلید عین اسلام ہو گئی! —— ہمارے نزدیک نہ تو یہ اسلامی فکر ہے اور نہ ہی راہِ اعتدال، ہاں بلاشبہ اسے افراط و تفریط کا نام دیا جائے گا۔ چنانچہ جس کا بھرپور مظاہرہ بعض ان مضامین میں ہوا ہے، جو اقبال اور اجتہاد کے موضوع پر اخبارات میں لکھے جا رہے ہیں —— زیرِ نظر مضمون میں افراط و تفریط کی انہی بے اعتدالیوں کو اعتدال کی راہ دکھائی گئی ہے۔

کچھ عرصہ سے اخبارات و رسائل میں علامہ اقبالؒ کے حوالے سے پارلیمانی اجتہاد کے موضوع پر خیال آرائی ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل نقطۂ نظر متعین کئے

جا سکتے ہیں:

۱۔ شریعت، بالخصوص سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل، کی روحِ عصر کے مطابق تعبیرِ نو ضروری ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ دور کے بدلتے تقاضے اجتہادِ نو کی دعوت دیتے ہیں۔ اور یہ اجتہاد موجودہ فرقہ وارانہ کشمکش میں پارلیمنٹ کا ہی معتبر ہو سکتا ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا کے جدید ترکی کی "گرینڈ نیشنل اسمبلی" نے بھی قرار دیا تھا کہ خلافت و امامت کو کئی افراد پر مشتمل ادارے یا منتخب اسمبلی کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ جدید دور میں یہی اجماعِ اُمت ہے۔ پاکستان میں نفاذِ شریعت کے لیے ائمہ سلف کی تقلید کی بجائے پارلیمنٹ کے سرکاری فیصلوں کی پابندی ہونی چاہیئے۔

۲۔ قرآن و سنت میں منصوص مسائل کے علاوہ ائمہ سلف نے خلفائے راشدین کے طرزِ عمل سے ماخوذ مکمل نظامِ حیات پیش کر دیا ہے۔ اب چونکہ مستقل اجتہاد کی اہلیت نہیں رہی، اس لیے انہی مدوّن کتبِ فقہ سے احکام کا استخراج کر کے کام چلانا چاہیئے جو شیعہ سُنّی مکاتبِ فکر کے ہاں مسلّمہ ہیں۔ ریاست کا مسلک اس فقہ کے مطابق ہو جس کے پیروکاروں کی ملک میں اکثریت ہو۔ اس معاملہ میں برتری علمائے فقہ کو حاصل ہے۔ اقلیتی فرقوں کو صرف پرسنل لاز میں آزادی دی جائے۔

۳۔ عقیدہ، عبادات اور عائلی مسائل میں ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ پر کاربند رہے۔ البتہ معاشرت، معیشت، اور سیاست سے متعلقہ امور پارلیمنٹ اسلامی اصولوں کی روشنی میں طے کرے۔ اس سلسلے میں ایسا رویہ اختیار کیا جائے کہ پارلیمنٹ میں علماء کو بھی بھرپور نمائندگی حاصل ہو۔ تاکہ بیک وقت مہارتِ علمی کے ساتھ ساتھ عوام کا اعتماد حاصل ہو جائے۔ چنانچہ اس کے لیے اسمبلی کی رکنیت کی شرائط اور بعض دیگر طریقوں کی تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔

۴۔ قرآن و سُنّت کی شکل میں مدون شریعت ہمارے پاس مکمل ہے۔ قرآن دستورِ حیات ہے تو سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کی حتمی اور ابدی تعبیر۔ اجتہاد انفرادی ہو یا اجتماعی، شریعت کا حصّہ نہیں۔ بلکہ پیش آمدہ مسائل کو منشاءِ الٰہی کے تابع انجام دینے اور شرع کی حدود کے اندر رکھنے کا طریقِ کار ہے۔ فتوائے

اور قضاء میں اجتہاد کی اہمیت شریعت کی وسعتوں کی دلیل ہے۔ اس بارے میں مجتہد کی غلطی پر بھی اسے مخلصانہ اجتہاد کا اجر ملے گا۔ لیکن فقہ و اجتہاد مختلف اور متعدد بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح مسائل کی نوعیت کی تبدیلی سے اجتہاد کا تغیر بھی ممکن ہے۔ پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اجتہاد سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ ان کا تعلق تدبیری اور انتظامی امور سے ہوتا ہے۔ فقہ کی تشکیل تو اور شریعت کی تقنین (قانون سازی) دو مختلف امر ہیں۔ شرع میں اضافہ و تبدیلی کی گنجائش خلیفہ یا امام کو بھی نہیں ہے۔ کیونکہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی میں نہیں دیا جا سکتا۔

تحریکِ پاکستان کے حوالے سے علامہ اقبال کا فکری مقام بلاشبہ تسلیم، اور اس تناظر میں فکرِ اقبال کی اپنی جگہ اہمیت بھی بجا ـــــ لیکن علامہ کی اس حیثیت کا یہ کوئی لازمی حصہ قطعاً نہیں کہ انہیں ائمۂ سلف کے مقابل لا کھڑا کیا جائے، اور پھر اس تقابل کے نتیجے میں ائمۂ سلف کو تو دورِ ملوکیت کا پروردہ، جبکہ اقبال کو اسلامی نشأۃِ ثانیہ کا حدی خواں ثابت کیا جائے ـــــ بالخصوص اس لیے کہ ائمۂ سلف اور اقبال کے میدان ہائے کار الگ الگ تھے اور انہیں پیش آنے والے حالات میں باہمی مماثلت ہی مفقود ہے!

جو لوگ اسلامی ریاست کی فکری تشکیل میں علامہ کے نظریات کو دلیل بنا کر انہیں مجتہدِ مستقل کا مقام دینا چاہتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ علامہ اقبال کے یہ نظریات ان کی ٹھوس آراء کی بجائے ان کے ارتقائی نظریات تھے۔ چنانچہ کائناتِ ارضی کے مختلف حصوں میں رونما ہونے والے واقعات پر غور و فکر کے نتیجے میں اقبال کے ان نظریات کو، جو فکرِ اقبال کے حاملین کو ان کے عقائد نظر آتے ہیں، منزل تک پہنچنے سے قبل، اس راہ کی ٹھوکروں یا درمیانی مراحل کا نام بھی دیا جا سکتا ہے! ـــــ حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو دیکھئے، "رؤیتِ ملکوتِ سماوی و ارضی" کے سلسلہ میں آپؑ، ستارے سے لے کر چاند اور پھر سورج تک کے لیے اپنے خاص عندیے کا اظہار فرماتے رہے، لیکن بالآخر آپؑ تائیدِ ایزدی سے اصل حقیقت کی تہ تک پہنچ گئے ـــــ قرآنِ مجید نے ان حالات کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اور مفسرین نے ان واقعات کو حضرت ابراہیمؑ کے ابتدائی غور و فکر کے مراحل قرار

دیا ہے[1] —— اس کے برعکس علامہ اقبال کے بارے میں مختلف خیالات کا اظہار کرنے والوں کے سر پر مشکل یہ سوار ہے کہ وہ ان کے نظریات کو ان کی پختہ اور حتمی آراء سمجھنے لگ گئے ہیں۔ حالانکہ اسلامی ریاست اس دور میں محض ایک تخیل تھا، اور ایسے تخیل سے مفکر کا تعلق زیادہ تر رومانوی ہوتا ہے، وہ اپنے افکار و نظریات کو اپنی آخری اور حتمی، عملی تجاویز کے طور پر پیش نہیں کرتا —— پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تشکیلِ ریاست کے بارے میں علامہ کی طرف سے ایسے فلسفیانہ مباحث میں شرکت کو، علامہ کی ائمۂ سلف پر برتری کی دلیل بنا لیا جائے؟ —— بالخصوص اس لیے کہ علامہ نے جس دور میں آنکھ کھولی، یہ مذہب و سیاست کی ثنویت یا اسلام اور سیکولرازم کی فکری جنگ کا زمانہ تھا، جس میں کہیں مذہبی روایات کے تحفظ پر جہاد ہو رہا تھا، تو کہیں سیاسی سطح پر اسلام کا نفاذ ہی وقت کی مسلم تحریکوں کا مطمعِ نظر بن رہا تھا۔ ان حالات میں فکری افراط و تفریط ایک لابدی امر تھا۔ لہٰذا آج، ائمۂ سلف کی نام لیوا بعض شخصیتوں کے طرزِ عمل کے حوالہ سے، خود ائمہ پر یوں کیچڑ اچھالنا کہ ان کی فقیہانہ مساعی ملوکیت کی تائید کے لیے تھیں، جبکہ علامہ اقبال اسلامی "نشأۃِ ثانیہ" کے واحد حدی خواں تھے، کوئی پسندیدہ رویہ نہیں کہلا سکتا —— بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص موجودہ مسلم تحریکوں کے قائدین پر یہ الزام تراشی شروع کر دے کہ ان کی تمام تر مساعی مسلمانوں میں سیکولر جمہوریت کو ترویج دینے کے لیے تھیں، تو اسے مستحسن فعل قرار نہیں دیا جائے گا!

دورِ جدید میں اسلامی مملکت کے مختلف پہلوؤں پر خیال آرائی کے لیے ہمارے سامنے ایک وسیع میدان ہے۔ چنانچہ جمہوریت و آمریت کا تقابل کرتے ہوئے اسلامی خلافت کے موضوع کو بھی زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے اور اس کی تشکیل کے لیے تجاویز بھی پیش کی جا سکتی ہیں —— لیکن عصرِ حاضر کے تناظر میں ائمۂ سلف کی کردار کشی کرنا، نہ صرف بہت بڑی جسارت اور پرلے درجے کی ناشکری ہے بلکہ انتہائی ناانصافی بھی[1] —— کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں کہ علمی سطح پر انہوں نے عبادات و معاملات کے جملہ پہلوؤں پر عملی تفصیلات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سیاست و حکومت کی غلط روشوں کا مردانہ وار مقابلہ بھی کیا ہے۔ کوئی تسلیم کرے نہ کرے، لیکن ائمہ اربعہ سمیت معتدبہ ائمہ

کی قربانیاں تاریخ کے اوراق میں ثبت ہو کر بقائے دوام کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں!

—— ہاں جب میں اور اب میں فرقِ بین یہ ہے کہ ان لوگوں نے سیاسی امور میں جو کچھ بھی کہا، شرعی نکات کی وضاحت کے لیے کہا۔ کیونکہ اس دور میں زندگی ایک وحدت تھی۔ حتیٰ کہ تدبیری اور انتظامی امور بھی شرعی ہدایات کی روشنی میں انجام پاتے تھے، جبکہ دورِ حاضر میں سیاست اور مذہب الگ الگ ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اسلام کے نام سے سیاسی فلسفے بھگارنے کو زندگی کے جامع فکر کی معراج سمجھا جاتے لگا ہے۔ مقامِ حیرت ہے کہ اسلام کی نظر میں سیاست و حکومت کی اس اہمیت کے باوجود، کہ ان کے جملہ امور شریعت کی نگرانی میں طے پاتے ہیں، آج کے دانشور یہ کہنے کی جرأت کر رہے ہیں کہ شریعت نے اسلامی حکومت کا کوئی مخصوص نظام نہیں دیا، لہٰذا احکامِ الٰہی کی غیر موجودگی میں اجتہاد سے یہ خلاء پُر کیا جائے گا۔ حالانکہ یہ لوگ اجتہاد کی تعریف ہی سے واقف نہیں —— اجتہاد کا کام شریعت کے خلاء پُر کرنا نہیں، بلکہ زندگی کے متنوع پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے شریعت کی وسعتوں کی تلاش اور انہیں احکامِ الٰہی کی حدود میں لانے کا نام اجتہاد ہے۔ تاکہ مسلمان مکمل طور پر اپنی زندگیاں منشاءِ الٰہی کے مطابق بسر کر سکیں۔ چنانچہ اسلام کا مکمل دستور کتاب و سنت ہیں، اور مذہب و سیاست کے جملہ امور اسی دستور کی روشنی میں انجام پاتے ہیں۔ جبکہ جدید ریاستوں کے موجودہ دساتیر صرف ملکی سیاست کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور انہیں فرد و معاشرہ کی غیر سیاسی زندگی سے براہِ راست کوئی سروکار نہیں ہوتا —— یہ دساتیر و قوانین ریاست کے حکمران یا عوامی نمائندے بناتے ہیں اور وہی ان کی تعبیر و تغییر کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام میں نہ تو دستورِ حیات انسانی عقل و تجربہ کا نتیجہ، یا اس کا محتاج ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی تعبیر و تنفیذ انسانی تگ و تاز پر منحصر رکھی گئی ہے —— بلکہ اللہ تعالیٰ نے کتاب (قرآنِ مجید) نازل فرما کر سنتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس کی تعبیر و تنفیذ ہمیشہ کے لیے کر دی ہے —— اب انسانی تفکر و تعقل سے ہزاروں نکتہ آفرینیاں تو کی جا سکتی ہیں، لیکن ان میں سے کسی کو بھی حتمی مرادِ الٰہی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہاں صرف اور صرف سنتِ رسولؐ ہی حتمی تعبیرِ دین ہے۔ کہ رسولؐ بہرحال معصوم ہوتا ہے، اور اس کے علاوہ کوئی شخص بھی

معصوم عن الخطاء نہیں سمجھا جا سکتا۔

اسلام کے اس دستوری فکر سے ناواقفی کی بناء پر ہی جدید سیاسی بزرجمہروں نے عوام کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی ہے کہ جس طرح دستور و قانون پارلیمنٹ و حکومت پہلے خود وضع کرتی ہے اور پھر اس کا نفاذ کرتی ہے، بالکل اسی طرح پہلے شریعت وضع کرنی پڑے گی اور پھر اس کا نفاذ عمل میں آئے گا۔ حالانکہ شریعت اللہ کی طرف سے مکمل ہو کر قیامت تک کے لیے نافذ ہو چکی، اور "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"[1] کے الفاظ سے اس کا اعلان بھی ہو چکا ہے ——— جس کا انتہائی واضح بلکہ عملی ثبوت یہ ہے کہ آج تک مسلمان اپنی غیر سیاسی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بھی شریعت کے احکام کی اتباع کرتے ہیں۔ ورنہ نفاذ سے قبل کسی قانون یا شرعی حکم کی تعمیل کا کوئی معنیٰ ہی نہیں ——— ہاں حکومت سے اگر نفاذِ شریعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اس کا معنیٰ صرف یہ ہے کہ وہ سیاسی سطح پر بھی اس کا اعلان کر کے اپنے تئیں مسلمان بنائے اور یوں عوام و حکومت کے رویوں میں یکسانیت پیدا ہو جائے۔

کتاب اللہ کی تنزیل کے ساتھ ساتھ تعبیرِ شریعت بھی ۲۳ سالہ دورِ نبوت میں مکمل ہو چکی ——— سورۃ النحل میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ - الآية" (النحل: ۸۹)

کہ "ہم نے کتاب (بتدریج) نازل فرما کر اس میں ہر شے بہت وضاحت سے پیش کر دی ہے!"

دوسری جگہ اسی سورہ میں ارشاد ہوا ہے

"وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ - الآية" (النحل: ۴۴)

کہ "ہم نے یہ ذکر آپؐ پر نازل فرمایا ہے، تاکہ آپؐ اسے لوگوں کے سامنے بیان کریں۔"

پھر قرآنِ مجید ہی نے بتلایا کہ جس طرح اللہ رب العزت نے قرآنِ مجید کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، اسی طرح اس کے بیان (تعبیر) کی حفاظت بھی اللہ

---

[1] المائدۃ: ۳

ربّ العزّت کے ذمہ ہے:

"إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۚ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۚ ثُمَّ
إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" (القیامۃ: ۱۷-۱۸-۱۹)

"اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھنا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔ (اے نبیؐ!) جب ہم قرآن پڑھیں تو آپؐ اس پڑھنے کی اتباع کریں۔ پھر اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے"!

——— یوں کتاب اللہ کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی (سنّت) میں پرو کر ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے، لہٰذا اسی کی پابندی کر کے ہم زندگی کے جملہ شعبوں میں راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں ——— گویا جب دستورِ حیات (قرآنِ مجید) بھی مل گیا اور اس کی تعبیر بھی سنّتِ رسولؐ کے ذریعہ متعین ہو چکی، تو ہمارا کام اب صرف یہ ہے کہ اسی دستور کو مضبوطی سے پکڑ کر اس پر عمل پیرا ہوں اور فرد و معاشرہ کی فلاح و نجات سے ہمکنار ہوں ——— اندریں صورت اسلام کی پارلیمانی تعبیر یا پرائیویٹ تعبیر کی بحث ہی بے بنیاد اور بلا جواز ہے ——— علماء ہوں یا حکومت اور عوام، سبھی کتاب و سنّت (اسلامی دستور و تعبیر) کے پابند ہیں، جو ان کی زندگی کے جملہ پہلوؤں کے لیے کامل و اکمل موجود و محفوظ ہیں۔ باقی رہا اجتہاد کا معاملہ، تو یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اجتہاد دراصل شرعی احکام ہی کی تلاش و اطلاق کا نام ہے، کوئی نئی شریعت وضع کر لینے کا نام نہیں! ——— لہٰذا اس سلسلہ میں ضرورتوں کے مطابق وہی لوگ راہنمائی دے سکتے ہیں جو کتاب و سنّت کے علوم کے ماہر اور ان کی بھرپور بصیرت رکھتے ہوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مریض کا علاج ڈاکٹر کرتا ہے، اور عمارت و مشین انجینئر کے ہاتھوں تیار ہوتی ہے، بالکل اسی طرح اجتہاد بھی ماہرینِ علومِ شریعت کا کام ہے، یہ ہر کس و ناکس کا روگ نہیں۔ ورنہ جس طرح نیم حکیم خطرۂ جان کا باعث بنتا ہے، بالکل اسی طرح نیم ملّا خطرۂ ایمان کا باعث بھی بنتا ہے، لہٰذا علماء کو تھیاکریسی کا طعن دے کر اجتہادی ذمہ داریاں عوام کے سپرد کر دینا نرا احمقانہ پن ہے ——— مقامِ غور ہے کہ اسلام میں جب نہ تو دستور و قانون وضع کرنے کا اختیار علماء کے پاس ہے اور نہ ہی اس کی تعبیر کا، تو تھیاکریسی (پاپائیت) کیونکر قائم ہو گی؟ ——— تھیاکریسی کی بنیادی روح، دستور و قانون کے سلسلہ میں کسی

خاص طبقے کی وضع و تعبیر کے اعتبار سے اجارہ داری ہے، جو دلیل کی بنیاد پر نہیں، بلکہ ذاتی برتری کی بناء پر مذہبی طبقے کو حاصل ہوتی ہے۔ یہی حال حکمرانوں کے "تصورِ اختیارِ حقوقِ ربانی" (DEVINE RULES OF KINGDOM) کا ہے۔ چنانچہ دستور و تعبیر میں علماء کو اتھارٹی مانا جائے یا حکمرانوں اور پارلیمنٹ کو، یہ بہر حال خدائی حقوق میں دخل اندازی ہے اور قرآنِ مجید نے جس کی یوں مذمت فرمائی ہے:

> "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ الآیۃ!"
> (التوبۃ: ۳۱)

> کہ "انہوں نے (یہود و نصاریٰ نے) اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب ٹھہرا لیا!"

مروی ہے کہ حضرت عدیؓ بن حاتم طائیؓ نے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب اس آیت پر یوں معارضہ پیش کیا کہ:

> "ہم اپنے علماء اور درویشوں کو رب نہیں کہتے۔"

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا تھا:

> "تم ان کے حلال کردہ کو حلال گردانتے ہو اور حرام کردہ کو حرام، یہی انہیں رب بنانا ہے!"

لہٰذا حقوقِ الٰہی میں دخل اندازی خواہ علماء کی تسلیم کی جائے یا حکومت و عوام اور پارلیمنٹ کی، یہ انہیں رب بنا لینے کے مترادف ہے ——— یہی وجہ ہے کہ ائمہ سلف نے خود کو کبھی اتھارٹی قرار نہیں دیا۔ بلکہ اس سلسلہ میں خود انہوں نے اپنے اقوال کو کتاب و سنت پر پیش کرنے، اور یوں اپنے استدلالات کی صحت و غلطی کا جائزہ لینے کی تلقین کی ہے ——— پھر موجودہ مذاہبِ فقہ یا فرقے نہ تو انہوں نے بنائے اور نہ ہی یہ ان کے زمانہ میں موجود تھے، بلکہ یہ تو مخصوص حالات کے نتیجہ کے طور پر ان ائمہ کی بلا جواز اور جامد تقلید کے ذریعے چوتھی صدی ہجری میں معرضِ وجود میں آئے۔ لہٰذا ان مذاہب یا فرقوں کو خود ان کے زمانہ میں ثابت کرنا ناممکن ہے ——— کجا یہ کہ بنی امیہ اور بنی عباس کے ادوارِ خلافت سے بڑھ کر، دورِ خلافتِ راشدہ میں ان کا وجود ثابت کرنے کی جسارت کی جائے۔

—— پس جب ائمہ سلف یا ان کی فقہ (جو ان کے متوسلین نے بعد میں ترتیب دی ہے) اتھارٹی نہیں، حالانکہ یہ کتاب و سنت پر عبور رکھتے تھے، تو پھر جدید دور کے قائدین اور حکومت یا ان کے اجتہادات (جو اجتہاد کی ابجد سے بھی واقف نہیں، تاوقتیکہ کتاب و سنت کی ماہرانہ بصیرت حاصل کریں) کیونکر اتھارٹی قرار دیئے جاسکتے ہیں؟ غور فرمایئے، جب پہلی شریعتیں، جو حکومتوں کی سرپرستی میں علماء کی کونسلوں کے ذریعے مدون کی جاتی رہیں، ان کے حلال و حرام کو بھی حتمی سمجھنا قرآنِ مجید نے خدائی اختیارات میں دخل اندازی قرار دیا ہے، تو اب شریعتِ محمدی، حکومتوں کے ہاتھوں انجام پذیر ہو کر کیونکر اتھارٹی بنے گی اور اس کی کیا حیثیت ہو گی؟ —— عیسائیت کی تدوین کے بارے میں اب تک بیس سے زیادہ کونسلوں نے جو کارنامہ سر انجام دیا ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔ ان میں بعض کونسلیں ایسی تھیں کہ حکومت کی سرپرستی میں، ان میں دو دو ہزار کے قریب علماء شریک ہوتے رہے۔ بایں ہمہ اس پاپائیت کو قبول نہیں کیا جا سکتا، تو وضعِ شریعت یا تعبیرِ شریعت کے نام پر "حقِ سبحانی" "حکومت" کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

یاد رہے، شریعت کی تدوین و تعبیرِ نو کا مسئلہ جدید دور کی پیداوار ہے، جو فرانس کی تقلید میں مسلمانوں میں درآمد ہوا ہے۔ ورنہ صحیح فکر یہ ہے کہ کتاب و سنت کی صورت میں شریعت کی تعبیر و تدوین پہلے سے موجود ہے۔ البتہ جہاں تک اجتہاد کا تعلق ہے، تو پہلے فقہاء کے اجتہادات اگرچہ فقہ و فتاویٰ کی ضخیم کتابوں کی صورت میں موجود ہیں، تاہم جدید طرز پر ان کی تدوین مقصود ہو تو یہ کام غلط بھی نہیں، بلکہ کسی حد تک مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ کام صاحبِ تقویٰ اور اس کے اہل لوگوں کے ہاتھوں انجام پائے —— لیکن آج اصل مسئلہ تدوین کا نہیں، بلکہ تدوین کے نام پر تقنین (یعنی شریعت کی قانون سازی) کا ہے۔ اور جسے دراصل جدید عربی لفظ "تشریع" سے مغالطہ کھا کر اپنایا گیا ہے۔ لہٰذا تدوین و تقنین کا فرق ملحوظ رہنا چاہیئے —— تدوین، ترتیبِ فقہ کی ایک صورت ہے، جو لازمی نہیں ہوتی جبکہ تقنین، کسی خاص تعبیرِ شریعت کو قانونی جامہ پہنانے کا نام ہے۔ جو ایک حتمی امر ہو کر جہاں شریعت سازی اور خدائی اختیارات میں دخل اندازی کا موجب بنتا ہے، وہاں

اسے اجتہاد بھی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کہ اجتہاد سے شریعت کی وسعتیں حاصل ہوتی ہیں، لیکن تقنین سے، فرد و معاشرہ کو ایک خاص تعبیرِ شریعت کا پابند قرار دے کر اجتہاد کے دروازے ان پر بند کر دیئے جاتے ہیں ــــ قرآنِ مجید کی نظر میں اس کا نام "اصر و غلال" ہے۔ اور جسے ختم کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے ــــ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ـ الاٰية!"

(الاعراف : ۱۵۷)

("یہ رسولِ کریمؐ) ان سے وہ بوجھ اور بندشیں دور کرتے ہیں، جن میں وہ جکڑے ہوئے ہیں۔"

ــــ یہ وہی بائیبل کی تدوین و تقنین کی جکڑ بندیوں کی طرف اشارہ ہے، لیکن ستم تو یہ ہے کہ آج کے متجددین، اُمتِ مسلمہ کو دوبارہ انہی جکڑ بندیوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں جن سے اللہ ربّ العزّت نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اپنے بندوں کو نجات دلائی تھی ــــ طرفہ یہ کہ اس نظریہ کے حامل لوگ جس شد و مد سے تقلید کی مخالفت کرتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ شور و غوغا آرائی کے ساتھ حکومت یا پارلیمنٹ کی تعبیر و تقنین کو اتھارٹی منوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ فکر و نظر کا یہ کتنا بڑا تضاد ہے؟ ــــ کیا یہ بات سوچنے کی نہیں کہ ائمۂ سلف کی تقلید، اگر ان کی مہارتِ علمی کے باوجود جائز نہیں تو آج کی پارلیمنٹ بغیر کسی ضماتِ صحت اور دلیل کے کیونکر اتھارٹی بن سکتی ہے؟

بعض حضرات نے علامہ اقبالؒ کے حوالہ سے ترکی میں "گرینڈ نیشنل اسمبلی" کا فیصلہ بھی شرعی اجماع قرار دیا ہے، کہ خلافت یا امامت کو کئی افراد پر مشتمل ادارے یا منتخب اسمبلی کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی بناء پر پارلیمنٹ کو خلیفہ یا امام کے قائم مقام ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ خلیفہ یا امام کو یہ مقام کہاں حاصل ہے کہ وہ شریعت کی تقنین "تعبیرِ نو" کے نام پر کرے؟ ــــ اسلامی تاریخ میں یہ عجمی تصور سب سے پہلے عبد اللہ ابن المقفع نے پیش کیا، جس کا ذکر اس کے ایک رسالہ مشمولہ "جمهرة رسائل العرب" میں بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ عجمی فکر امام مالک وغیرہ ائمۂ دین رحمہم اللہ

کی پر زور مخالفت کی بناء پر پنپ نہ سکا۔ بلکہ ابن المقفع کے ایسے ہی لادینی افکار اسے ارتداد تک لے گئے اور انہی کی پاداش میں وہ قتل کر دیا گیا۔

ابن المقفع کے اس تصور کی وجہ بھی وہی تھی، جو آجکل کے متجددین فقہی اختلافات کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں —— اس نے خلیفہ منصور سے یہ کہا تھا کہ مفتی حضرات کے اختلافِ فتاوٰی اور قاضیوں کے متنوع فیصلوں کی بناء پر فکری انتشار بڑھ رہا ہے۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ خلیفہ ان تمام مختلف آراء کو جمع کر کے ان سے متعلق ایک ایسی حتمی رائے متعین کر دے، جس کے سب مفتی اور قاضی حضرات پابند ہوں۔ لیکن امام مالکؒ نے اس فکر کی بھرپور مخالفت کی۔ اور تا دمِ آخر کرتے رہے —— ان کا مشہور مقولہ ہے کہ:

"مَا مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَوْلُهٗ مَقْبُوْلٌ اَوْ مَرْدُوْدٌ عَلَيْهِ اِلَّا صَاحِبَ هٰذَا الْقَبْرِ"

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہر کسی کی بات قبول بھی کی جا سکتی ہے اور رد بھی کی جا سکتی ہے۔ ہاں آپؐ کی بات صرف قبول ہی کی جائے گی، رد ہرگز نہیں کی جائے گی۔

آخری مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید نے اسی تجویز کو ایک دوسری صورت میں پیش کیا کہ کیوں نہ امام مالکؒ کی مؤطا کو کعبہ میں لٹکا کر جملہ دیار و امصار کے مجتہدین کو اس کا پابند بنا دیا جائے؟ —— لیکن آپؒ نے اس صورت کو بھی قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مؤطا ساری شریعت کا مجموعہ نہیں۔ جبکہ صحابہؓ و تابعینؒ کے مختلف علاقوں میں پھیل جانے سے احادیث لوگوں کے پاس پہنچ چکی ہیں اور وہ ان پر عمل کر رہے ہیں۔ لہٰذا اصل اتباع وحی کی ہے خواہ وہ مؤطا میں مندرج ہو یا نہ! —— یوں یہ عجمی فکر ایک لمبے عرصہ تک دوبارہ سر نہ اٹھا سکا۔

امام ابوحنیفہؒ تو اس سے بھی بڑھ کر محتاط تھے —— قاضی کا اجتہاد اگرچہ شرعی امر ہوتا ہے اور وہ مخلصانہ مگر غلط بھی ہو تو لاگو ہوتا ہے، تاہم امام ابوحنیفہؒ نے منصبِ قضاء کو قبول کرنے سے صرف اس خطرے کی بناء پر انکار کر دیا کہ مبادا ان پر دباؤ ڈالا جائے اور حکومتِ وقت انہیں اپنی خواہشات کے سامنے جھکنے پر

مجبور کرے۔

اسی طرح امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے عقیدہ و عمل کے بعض بظاہر معمولی مسائل میں حکومت کی فکری آمریت کو تسلیم نہ کیا۔ اس جرم میں انہوں نے ذلت و نکبت کو تو بخوشی قبول کر لیا، لیکن دین و شریعت پر آنچ نہ آنے دی —— ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ اقتدارِ حکومت اور شریعت کی اتھارٹی دو علیحدہ امر ہیں، حکومت وقت چونکہ اپنی "تعبیرِ شریعت" پر مجبور کر کے اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہی ہے، لہٰذا خلافت تسلیم ہونے کے باوجود تعبیرِ شریعت کی یہ آمریت ہرگز قبول نہیں کی جا سکتی! —— گویا ائمۂ سلف نے سیاسی مسائل میں بھی آمریت کو منظور نہ کیا اور اس کی خاطر اپنی جان اور عزت بھی داؤ پر لگا دی —— کیا ایسے لوگوں کو دورِ ملوکیت کا پروردہ کہا جا سکتا، یا ان پر آمریت کی ہمنوائی کا طعن کیا جا سکتا ہے؟

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ان ائمۂ سلف کی آراء بھی صرف اس وجہ سے قبول نہیں کی جاتیں اور دین میں حجت تسلیم نہیں کی جاتیں، کہ وہ انفرادی حیثیت رکھتی ہیں، تو کیا علامہ اقبال کی رائے بھی انفرادی رائے نہیں؟ —— اس رائے پر کون سی اسمبلی کا اجماع ہو چکا ہے؟ —— فافہم فتدبّر!

(مدیر)

شعر و ادب

کسی پر بڑائی نہ کوئی جتائے

جناب فضل روپڑی

خدا نے شعوب و قبائل بنائے — کہ انسان اصل اپنی پہچان جائے
ہوئے پیشے تقسیم پھر اللہ اللہ — کہ ہر ایک رزق اپنا اپنا کمائے
برابر ہیں سب آفرینش میں انساں — کسی پر بڑائی نہ کوئی جتائے
کئے انبیاءؑ نے بھی سب کام اپنے — کبھی بدگمانی نہ وہ دل میں لائے
لہٰذا نہیں اس کا ہرگز یہ مطلب — کہ انساں کسی کو نہ خاطر میں لائے
زمانے کے انداز بدلے گئے ہیں — نہیں کام آتے ہیں اب اپنے پرائے
دکھائے ہیں قسمت نے یہ دن بھی ہم کو — اب اپنے کرم سے خدا ہی بچائے